مولانا مرحوم نے راقم الحروف کو قلمبند کرائی جو محفوظ ہے۔ اور کسی موقع پر شائع کی جائے گی۔

احرار نے جہادِ آزادی کے سلسلہ میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو نتیجۃً مولانا کو ۱۹۴۲ء کا سال ڈیرہ اسماعیل خان جیل میں گذارنا پڑا۔ احراری سرگرمیوں کے ساتھ جمعیۃ العلماء ہند کی رکنیت بھی قائم رکھی اور اس کے کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریکِ ختمِ نبوت چلی تو اس میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علماء حق کا شیرازہ مجتمع کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی تو ۱۹۵۶ء میں حضرت شیخنا و استاذنا مولانا احمد علی لاہوریؒ کی سرپرستی و قیادت میں جمعیۃ العلماء اسلام کو وسیع پیمانے پر از سرِ نو منظم کیا۔ مولانا مرحوم پہلے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے، اور حضرت لاہوری قدس سرہٗ جمعیۃ کے پہلے امیر۔ اور پھر جب علماء کے بچھڑے ہوئے قافلہ کی ترتیب اور نئی شیرازہ بندی میں منہمک ہو گئے تو اخلاص جوشِ عمل اور سوزِ دروں کا زادِ راہ لیکر اس کام میں وہ وہ صعوبتیں اور مشقتیں اٹھائیں کہ الامان الحفیظ۔ بڑوں کے ناز اور ہمعصروں کے نخرے اٹھائے، چھوٹوں کی منتیں کیں۔ بزرگوں کے بستر اور جوتے اٹھا اٹھا کر اور خوشامد کر کر کے انہیں مدرسہ و خانقاہ کے گوشہ ہائے عافیت سے نظم و جماعت اور جہاد و سیاست کی رزم گاہ میں کھینچنا چاہا اس آثار دکھی سوکھی پر گذارا کرتے رہے، جو قوت لایموت ملی بھی اسے اس دور میں جمعیۃ کے آرگن "ترجمانِ اسلام" کے زندہ رکھنے میں خرچ کیا، یہاں تک کہ موٹا جوٹا کھدر قسم کا جو ایک جوڑا تھا، جمعیۃ کے دفتر دہلی دروازہ میں قیام کے دوران اسکی دھلائی بھی قیمتاً نہ کر سکتے تو خود لنگی باندھ کر اسے دھو لیتے کہ بچے ہوئے پیسے اخبار کے اخراجات میں لگ جائیں گے۔

یہ سارا عرصہ دین کی اشاعت باطل کے تعاقب اور جماعتی تنظیموں کے سلسلہ میں "ہر صبح سفر ہر شام سفر" کا مصداق رہا۔ مگر سفر بھی کیسا کہ بغل میں چھوٹا سا بستہ ایک جوڑا کپڑے اور حوالہ کیلئے فرق باطلہ کی دو چار کتابیں، روکھی سوکھی خشک روٹی، تھرڈ کلاس میں سوار ہوتے جگہ نہ ملی تو چپکے سے کسی کونہ میں چادر بچھا کر بیٹھ گئے، رات بھر پاؤں پھیلانے کی کوئی جگہ نہ ملی تو بیٹھنے کی نشستوں میں کسی سیٹ کے نیچے چادر بچھا دی اور لیٹ گئے منزلِ مقصود پر پہنچے، خرمنِ باطل پر یلغار کر دی، اگر کسی جگہ واعظہ پر پابندی ہے تو جل دے کر یہ جا وہ جا اور اب کسی اور محاذ پر شبخون مارنے کے درپے ہیں۔ نہ صلہ کے طالب نہ ستائش کی تمنا اور نہ میزبان کی میزبانیوں سے لطف اندوز ہونے کی فرصت و خواہش۔ ۱۹۵۸ء میں جمعیۃ پر پابندی لگی تو نظام العلماء کے نام سے جمعیۃ اور اخبار کا کام نہایت کٹھن حالات میں جاری رکھا۔ ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کیلئے ہزارہ کے ایک حلقہ سے انتخابات جیت کر منتخب ہوئے یہ علاقے عموماً دشوار گذار پہاڑوں اور دروں سے اٹے ہوئے تھے، مواصلات منقطع، اور وسائل الیکشن بھی قطعی ناپید، اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ ان علاقوں پر ایک طویل اور قدیم عرصہ سے جاگیرداروں اور خوانین کی ایسی مضبوط گرفت تھی کہ بظاہر یہ قبائلی اور نیم آزاد علاقے شخصی راجواڑے اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت اختیار کر

گئے تھے۔ نوری اور عالم تو اس نظام میں عموماً تیسرے درجہ کا شہری بنا دیا جاتا ہے۔ جس کا کام صرف نماز پڑھانا اور تجہیز و تکفین اور تدفین کے کاموں میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ اور بس ان خوانین اور زمینداروں کے خلاف نبرد آزما ہوتا اور ان کے غرور و نخوت کو للکارنا مولانا مرحوم جیسے دل گردے والے شخص کا کام تھا۔ جو واقعی شیر سرحد کہلانے کا مستحق تھا۔ عالمی استبداد کے مقابلہ کے ساتھ ساتھ مولانا ایک طویل عرصہ سے اس علاقائی استبداد اور "خان ازم" سے بھی مصروفِ جنگ رہے۔ الیکشن میں اس بے سروسامان مردِ فقیر نے یہ جنگ بالآخر جیت لی اور اس علاقہ کے علماء اور دینی پسماندہ طبقے بھی معاشرہ میں اس مجد و شرف سے دوبارہ ہمکنار ہو گئے جن کے وہ حقیقی مستحق تھے۔ یہ مولانا کی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ جو نظروں سے عموماً اوجھل رہا ہے۔

اسمبلی میں پہنچ کر ملک کا وہ سرکردہ طبقہ اب براہِ راست آپ کی زد میں آنے لگا جو اب تک سٹیج اور منبر و محراب سے آپ کا نشانہ بنتا تھا اور جسکی اکثریت کو قرآن کریم نے "اکابر مجرمیھا" سے تعبیر کیا ہے۔ مترفین اور صنادید کا یہ طبقہ مولانا کے تیز و تلخ نشتروں سے تلملا اٹھا۔ اس اثنار میں عائلی قوانین جسے اسوقت کی حکومت نے اپنے وقار کا مسئلہ بنا دیا تھا، کے خلاف آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ جن میں کتاب اللہ، سنتِ رسول اور تعامل صحابہؓ کی صریحاً خلاف ورزی کی گئی تھی۔ تجدد اور ترقی پسندی کا مقام تجدید و امامت حاصل کرنے کے شوق میں اس وقت کے صدر نے انہیں نافذ کر دیا جس کے محرکات میں اس صدر مرحوم کے گھریلو اور خانگی کچھ عوامل بھی کارفرما رہے، جس نے بچپن سے موصوف کو "تعدد ازدواج" سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اسمبلی میں اس کے خلاف قرارداد پیش ہوئی۔ فضا ناساز بلکہ مخالف تھی۔ مگر مولانا نے برجستہ ایسی عالمانہ اور پُر مغز اور مؤثر تقریر فرمائی کہ ایوان کی اکثریت نے اس قرارداد کی تائید کی اور وہ پاس ہو گئی۔ اس سے مغرب زدہ طبقہ عموماً اور آزادیٔ نسواں کی شوقین خواتین میں خصوصاً اضطراب کی لہر دوڑ گئی، مولانا کا جی بھر کر مذاق اڑایا گیا۔ مگر اظہارِ حق اور غلبۂ حق کی یہ سعادت مولانا کو حاصل ہو گئی۔ بعد میں جب وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تب بھی ان قوانین کے خلاف مؤثر ترجمانی کی۔ اور اسمبلی میں موجود تجدد پسند خواتین ان کے چبھتے ہوئے ظریفانہ نشتروں سے سٹپٹا کر رہ جاتیں۔ نشتر زنی اور حاضر جوابی سے مقابل کے وار کو اُسی کیطرف پلٹا دینا مولانا کی پوری اجتماعی اور پارلیمانی زندگی کا ایک دلچسپ باب ہے۔

بالآخر رفتہ رفتہ مولانا کا شہرہ ملک سے باہر بھی پہنچا ۱۹۶۴ء ۱۹۶۵ء میں انہوں نے دو دفعہ مصر کے مجمع البحوث الاسلامیہ میں شرکت کی اور عالمی علماء و ارباب دانش سے خطاب کیا۔ پہلی بار ۱۹۶۴ء میں قاہرہ سے واپسی پہ مدینہ منورہ تشریف لائے۔ خوش قسمتی سے احقر بھی وہاں موجود تھا۔ حضرت بنوریؒ حضرت مفتی محمودؒ۔ حضرت مولانا ہزاروی مرحوم یہ تینوں اکابر اکٹھے تھے۔ پھر عرفات میں بھی ان اکابر کی ایک گونہ ہمرکابی کا شرف ملا۔ مولانا مرحوم کا حرمین بالخصوص مدینہ طیبہ میں سوز و گداز، استغراق و انہماک قابلِ دید تھا۔ پھر تو بارہا سعادتِ حج و زیارت سے مشرف ہوتے

اس معاملہ میں مجھ جیسے اصاغر کی مخالفانہ رائے معلوم ہوئی تو ایک بار پھر مجھے نشانہ بننا پڑا۔ بہرحال اتحاد ہوگیا، حکومت قائم ہوگئی، اُدھر ملک میں ایک ایسے آمر کا دور دورہ تھا۔ جو بڑی عیاری سے اسلام، غریب اور مزدور کا نام استعمال کرتا تھا۔ یہ غریب اور مزدور قسم کے نعرے بھی مولانا کا زندگی بھر کمزوری رہے۔ وہ عمر بھر جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ ذہنیت سے متنفر تھے۔ خود شانِ بوزرجمی لئے ہوئے تھے اور ذہن و فکر کے ساتھ اپنے قلندرانہ انداز میں بھی مولانا حسرت موہانی مولانا عبیداللہ سندھی جیسے حضرات کا نمونہ تھے۔ اس وقت کے حکمران کو مولانا کی اس طبیعت کا اندازہ تھا، اس نے بڑے شاطرانہ انداز میں اسلام کے ایک مخلص سپاہی کا لبادہ اوڑھ کر عجز و انکساری کا پیکر بن کر مولاناؒ کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا ان کے شاطر حواریین اور مقربین نے بھی مولانا کو نرغے میں لے لیا نفاذ اسلام اور غریبوں کے انقلابی منصوبے اور عزائم ان کے سامنے رکھتے رہے اپنوں کے بارہ میں بھی مولانا نے کچھ بے اعتنائی کچھ بے نیازی اور قدر مراتب کو ملحوظ نہ رکھنے کا رویہ محسوس کیا جس نے بُعد و گریز کی یہ خلیج اور بڑھا دی۔ اور رفتہ رفتہ وہ اقتدار کے اس کیمپ میں چلے گئے جن سے ان کی جمعیۃ برسرپیکار تھی۔ اس بارہ میں بھی مولانا کی ایک رائے تھی کہ عوام بالخصوص نوجوان نسل اور مزدور اور پسماندہ طبقہ نے انتخابات میں جس بھاری اکثریت سے بھٹو مرحوم کا ساتھ دیا تھا وہ تعلق و اعتماد مولانا کے خیال میں اب بھی قائم تھا۔ (جو درحقیقت مولانا کی خوش فہمی تھی) اور ملک کی اتنی بڑی طاقت خاص طور سے نئی نسل کے نوجوانوں کے ساتھ محاذ آرائی میں اسلام اور علماء کرام کیلئے مصلحت بینی نہیں انہیں اپنے سے متنفر کرنے کی بجائے ان سے مل کر اس قوت و طاقت کو دین کیلئے استعمال کیا جائے۔ یہ مولانا کی ایک اجتہادی رائے تھی، حالات نے ثابت کر دیا کہ وہ سراب کو پانی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ مولانا کی اجتہادی غلطی تھی مگر نیت میں اگر خلوص ہو اور ہوی و ہوس اور ذاتی نفع و نقصان کے شائبہ سے اگر عمل خالی ہو تو۔ اللہ کریم ایسی غلطیوں پر بھی اجر حسن عطا فرما دیتے ہیں۔ اس سارے مرحلہ میں جبکہ انہیں جان سے زیادہ اپنی عزیز جماعت سے ہاتھ دھونا پڑا جسے انہوں نے بویا تھا۔ اور پھر خون پسینے سے سینچا تھا۔ اور جو ان ہی کے نام پر ہزاروی گروپ کہلایا۔

کسی بدترین مخالف کو بھی یہ ثابت کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مولانا نے اپنی ذات کے لئے کچھ نفع اٹھایا، بنگلے پرمٹ اور پلاٹ حاصل کئے۔ نہ تو وہ پکے نہ جھکے، ایک رائے قائم ہوئی، غلط یا صحیح اور اس پر ایسے ڈٹ گئے کہ ساری دنیا ایک طرف اور ان کی بے لچک طبیعت ایک طرف، نہ اپنوں کی خفگی کی پرواہ، نہ کسی کو خوش کرنے کی خواہش، مخالفین نے جو الزامات لگائے وہ بھی محض سیاسی مخالفت میں جنہیں ان کا بے ضمیر ضمیر خود بھی جھٹلاتا تھا۔ مگر جس جماعت سے الگ ہوئے تھے۔ اس کے اکابر الزامات تو کیا لگاتے، ایسے ہر قسم کے طمع و لالچ ترغیب و تحریص پر مبنی الزامات کی برسرِ عام نفی کرتے اور مولانا مرحوم کی صفائی کرتے، حضرت مفتی محمود صاحبؒ

نے احقر کو زندگی کے آخری ملاقات میں جو ۳ ستمبر ۱۹۸۰ء کو کراچی میں ہوئی کسی بات کے دوران کہا کہ میرا ایمان ہے کہ مولانا ہزاروی بکے نہیں نہ کچھ فائدہ اٹھایا مگر اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اور دشمن کی عیاری اور شاطرانہ داؤ پیچ میں آکر کٹ گئے۔ یہ مولانا کی مخلصانہ زندگی پر ایک واضح شہادت ہے۔ جو ان کے عمر بھر کے ساتھی مگر آخری دور کے حریف نے متعدد بار دی۔

بہر حال حکومت کے ساتھ مصالحت آمیز رویّہ کے بعد ایوان میں اسلامی مسائل کے بارہ میں مولانا کے اندازِ بیان میں وہ گھن گرج، شدت، اور تلخی تو باقی نہ رہ سکی مگر کوئی بھی موقعہ اظہارِ حق اور دینی موقف پیش کرنے کا آیا تو مولٰنا نے ایوان کے ساتھی علماء سے الگ تھلگ رہ کر بھی پورے خلوص وللہیت سے فریضۂ اظہارِ حق میں کوتاہی نہ کی وہ حکومت کے ہمنوا تھے مگر آئین سازی کے موقع پر نہایت اہم اسلامی اور جمہوری ترامیم پیش کرتے رہے جو ریکارڈ پر موجود ہیں قادیانی مسئلہ اسمبلی کے سامنے آیا تو پورے حزبِ اختلاف نے متفقہ طور پر "ملت اسلامیہ کے موقف" کے نام سے بیان مرتب کیا جسے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قدس سرہٗ نے کئی نشستوں میں پڑھ کر سنایا۔ جس کا آدھا حصّہ ہمارے فاضل دوست مولانا محمد تقی عثمانی نے قلمبند کیا اور آدھے حصّے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے اس ناچیز کو دی۔

حضرت مولانا ہزاروی مرحوم ظاہر ہے کہ حزب اختلاف کیطرف سے پیش کئے جانے والے اس بیان پر دستخط نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا مزاج ہی اسے قبول نہیں کرتا تھا مگر انہوں نے سکوت و لاتعلقی بھی اختیار نہیں کی بلکہ محضر نامہ کے نام سے دو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ایک طویل مدلل اور محققانہ مقالہ قلمبند کرا کر شائع کیا اور پھر اسے ارکانِ اسمبلی میں تقسیم کیا یہ کام آٹھ دس دن ہی میں کرنے کا تھا۔ ہمارے ساتھ تو پوری ٹیم اور جماعت تھی جس نے کتابت وطباعت کا یہ معرکہ سر کیا مگر مولانا مرحوم نے بالکل اکیلے یہ ہفت خوان سر کیا، کتنے مصائب جھیلے ہوں گے۔ پروف بھی خود دیکھا پریس کے چکر بھی اس زار و نحیف بوڑھے سپاہی نے اکیلے کاٹے۔ مولانا کی ایک بڑی نایاب و نادر خوبی سیاست کے ہنگاموں، سٹیج کے شور و شر، بحث و مناظرہ کی گرما گرمی کے ساتھ ساتھ زہد و ریاضت اور اوراد و وظائف، شب بیداری اور اپنے رب سے سوز و گداز کے روابط کا برقرار رکھنا تھا جو اس دور میں عنقا سے کم نہیں۔ وہ بلاشبہ باللیل رھبانٌ وبالنہار فرسان۔ (رات کو راہب دن کو شہسوار) کا نمونہ تھے۔ جامِ شریعت کے ساتھ سندانِ عشق نباہنا تو سنتے ہیں۔ مگر خارزارِ سیاست میں شریعت و طریقت کے ساتھ ساتھ سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی کی قبائے افتخار کو بھی تار تار ہونے سے بچا کر چلنا اس صنیعِ اسلام ہی کا کام تھا۔

کون کون سی ادا اور کون کون سی خوبی ہے جس سے ہمارے ان بزرگوں کا گلشنِ حیات مالا مال نہیں۔ وہ جب گذر جاتے ہیں تو ہمیں قدر آتی ہے۔ پھر ایک ایک بات کو لوگ لئے روتے ہیں کہ زمانہ نہایت بانجھ ہوتا جا رہا مہیب خلاؤں کا سماں ہے۔ مولانا مرحوم کا ذکر چلا تو عنانِ قلم روکنے سے بھی نہ رک سکا۔

مولاناؒ کے جنازہ پر جاکر زیارت اور کاندھا دینے کی سعادت نصیب ہوئی، فقر و قناعت، زہد و تقویٰ، جہاد و سیاست، حمیت و شجاعت کا یہ گنج گرانمایہ سپردِ خاک کر دینے کے بعد جب ہم لوگ دیارِ لیلیٰ کی تنگ گلیوں سے گذرتے ہوئے واپس ہو رہے تھے تو ایک ثقہ متدین قسم کے بزرگ نے مجھے ایک واقعہ سنایا اور اسی واقعہ پر ان سطور کو ختم کرتا ہوں:

"مولانا مرحوم کے جوش و جوانی کا دور تھا، اب جبکہ وہ نرینہ اولاد سے محروم دنیا سے کوچ کر گئے مگر مولانا کی نرینہ اولاد پیدا ہوئی، ایسے ایک موقع پر مولانا کا صاحبزادہ اکلوتا بیٹا جو بڑھاپے کا سہارا بن سکتا تھا. شدید بیمار ہوا، بیماری سکراتِ موت کی حدود میں داخل ہوئی کہ اچانک بالاکوٹ سے اطلاع آئی کہ وہاں قادیانیوں نے پر پرزے نکال لئے ہیں۔ اور فوراً پہنچنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نے جاں بلب لختِ جگر کو اسی حالت میں چھوڑ دیا۔ تقریر و مناظرہ کی کتابیں بغل میں اٹھائیں اور چل پڑے۔ لوگوں نے بے حد روکا کہ بچے کی حالت مخدوش ہے۔ فرمایا تم لوگ موجود ہو اور وہاں ناموسِ ختمِ نبوت کے تحفظ کی بات ہے۔ روانہ ہوئے۔ ابھی بفہ کی ذیلی سڑک سے بالاکوٹ جانے والی سڑک پر پہنچے تھے کہ کسی نے نورِ نظر بیٹے کی وفات کی اطلاع دی۔ فرمایا تم لوگ دفن کر دینا، اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی۔ مجھے بالاکوٹ پہنچ کر قادیانیوں کا تعاقب کرنا ہے۔ اللہ اور رسول کی بات ہر چیز پر مقدم ہے۔"

مولاناؒ نے بیٹے کے آخری دیدار اور پدری شفقت و محبت کو بھی ناموسِ دین پر قربان کر دیا۔ اور اپنے روحانی مقتدا سیدنا ابراہیمؑ کی سنت کی پیروی کی ایک اور تابندہ مثال قائم کر دی۔ مجھے خیال آیا کہ کیا عجب آج کی شام بھی ملاءِ اعلیٰ ایک بار پھر اس ندائے ربانی سے گونج اٹھی ہو کہ:

وناديناه ان يا ابراهيم قد صدقت الرويا انا كذلك نجزي المحسنين ○ يا ايتها النفس المطمئنة ارجعي الى ربك راضية مرضيه فادخلي في عبادي وادخلي جنتي۔

سمیع الحق